© rasailojaraid.com

حالات وواقعات

ڈاکٹر ابراہیم موسیٰ

دینی مدارس، دہشت گردی اور عالمی پالیسی ساز طاقتیں

[مصنف کی کتاب What is a Madarasa? کی ایک فصل]

اکثر پالیسی ساز افراد اور ادارے جو فیصلے کرتے ہیں وہ یا تو ذرائع ابلاغ کی رپورٹوں پر مبنی ہوتے ہیں یا پھر انٹیلی جنس کی گمراہ کن رپورٹوں پر۔ مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں مدارس کا کردار کیا ہے، اگر مجھے اس کی تشریح و وضاحت کا موقع دیا جائے اور مجھے صدر امریکہ، امریکی کانگریس کے ارکان اور دنیا کی کسی بھی حکومت کو مدارس کے تعلق سے مشورہ دینا ہو تو میں اپنی کتاب ''دینی مدارس: عصری معنویت اور جدید تقاضے'' کا ایک نسخہ اس مکتوب کے ساتھ انھیں ارسال کرنا چاہوں گا:

محترم صدر امریکہ اور امریکی کانگریس کے معزز ارکان!

تصور کیجیے کہ جنوبی ایشیا میں تعینات امریکی فوج پر یا خدانخواستہ امریکہ کے مرکزی مقام پر ایک ایسا دہشت گردانہ حملہ، جس کی منصوبہ بندی پاکستان میں کی گئی ہو، کامیاب ہو جائے، تو کیا امریکہ اس کے ردِعمل میں آ کر افغانستان اور پاکستان (افغان-پاک سرحدی علاقے) میں قائم مدارس کی اینٹ سے اینٹ بجادے گا؟ یا مدارس کی عمارتوں پر ڈرون حملے کرے گا؟ یہ منظر نامہ یقینی طور پر امکان کے دائرے میں ہے۔ ماضی کے مشاہدات گواہ ہیں کہ امریکہ کو جب کبھی شکست کا زخم لگا تو اس کے اندمال کے لیے امریکی سیاسی قیادت نے کسی نہ کسی کو قربانی کا بکرا بنانے کو آسان اور ضروری سمجھا۔ چناں چہ Bay of Pigs کی مہم کی ناکامی کے بعد ویتنام کو اور گیارہ ستمبر کے واقعے کے بعد عراق پر حملے کے ذریعہ امریکہ نے اپنی جھینپ مٹانے کی کوشش کی۔ بنابریں افغان پاک سرحدی علاقے میں ڈرون بموں کے ذریعہ کیے جانے والے ایک پرشور حملے کے امکان کو کاملاً مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے بھی کہ کم درجے کے ڈرون حملے وہاں پہلے سے ہی جاری ہیں۔

بدقسمتی سے انٹیلی جنس کے ذرائع اور گھاگ قسم کے ماہرین نے اپنی شطارت و مہارت کے ساتھ جنوبی ایشیا کے مدارس کی یہ تصویر کشی کی کہ وہ نہ صرف امریکہ کے ازلی دشمن ہیں بلکہ وہ مغرب اور پوری متمدن دنیا کے بدترین دشمن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں۔ بغیر کسی ثبوت وشہادت کے متعدد کالم نگاروں اور صحافیوں نے مدارس اور دہشت گردی کے مابین رابطہ پیدا کرنے کے عمل کے ذریعہ اپنی جیبیں بھرنے کی کوشش کی۔

مجھے امید ہے کہ کوئی بھی حادثاتی منظر نامہ وہائٹ ہاؤس، قانون سازوں اور امریکی عوام کو اس بات پر مائل نہیں کرے گا کہ وہ اس طرح مدارس کو اپنے حملوں کا نشانہ بنانے کی راہ اختیار کریں۔ میری کتاب ''دینی مدارس: عصری معنویت اور جدید تقاضے'' یقینی طور پر آپ کو اصل حقائق سے مطلع کرے گی۔ لیکن اسی کے ساتھ آپ کو ڈونالڈ رمس فیلڈ اور حتی کہ کولن پاویل جیسے سنجیدہ و بردبار سیاست دانوں کے اقوال کو بھی نظر انداز کرنا پڑے گا جنھوں نے مدارس کی شبیہ کو نہایت ہیبت ناک اور لرزہ خیز بنا دیا۔ آپ کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ ان دونوں افراد نے جارج ڈبلیو بش کی انتظامیہ میں عراق پر جنگ مسلط کرنے کے فیصلے میں اور پھر جنگ کے دوران فاش غلطیاں کیں۔

اس میں شک نہیں کہ طالبان نے مدارس اور علما کی شبیہ کو خراب کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ لیکن یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ طالبان وابستگان مدارس کا محض ایک طبقہ یا گروہ ہے۔ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی اکثریت مدارس کو دینی علوم کی دانش گاہ کی شکل میں دیکھتی ہے، نہ کہ دہشت گردی کے مراکز کی شکل میں۔ وہ مدارس کے ساتھ تعاون کرتی ہے کیوں کہ وہ بجا طور پر یہ سمجھتی ہے کہ وہ مسلم سماج کی خدمات میں مصروف ہیں۔ عام طور پر مسلمان مدارس کو امریکی اور یورپی باشندوں کی طرح سے خطرے کی علامت تصور نہیں کرتے۔

اب امریکی انتظامیہ کے لیے وہ وقت آ گیا ہے کہ وہ عالمی سطح پر پھیلے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ تعامل کے بارے میں اپنے موقف کو درست کرے۔ مسلم معاشروں کے خلاف ثقافتی جنگ چھیڑ دینا مسئلے کا حل نہیں ہے۔ اس سے صورت حال مزید سنگین ہوگی۔ افغانستان اور عراق پر امریکی حملوں نے عالمی سطح پر مسلم اقوام کے اعتماد کو زبردست ٹھیس پہنچائی ہے۔ اور اس زمرے میں متوسط اور اعلیٰ دونوں طبقات شامل ہیں۔ مسلمان خاص طور پر نوجوان مسلم طبقے کا احساس ہے کہ بین الاقوامی برادری نے اسے جیسے اچھوت سمجھ لیا ہے، جس کے ساتھ اس کے مذہب کی بنیاد پر تفریق و امتیاز برتا جا رہا ہے۔ اب مسلم مخالف احساسات نے اسلاموفوبیا کی شکل اختیار کر لی ہے۔

مدارس کے ساتھ معاندانہ برتاؤ امریکہ کی پبلک ڈپلومیسی کی ایک تاریخی ناکامی ہوگی۔ اس نوع کے برتاؤ سے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے ساتھ تعلقات مزید بد سے بدتر ہو جائیں گے اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے مسلمانوں، خاص طور پر یورپ، شمالی امریکہ اور افریقہ میں مقیم مسلمانوں پر اس کے بدترین اثرات مرتب ہوں گے۔

مسلم ممالک کے اعلیٰ طبقات سے تعلق رکھنے والے سیکولر افراد یا فوج سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی باتوں کو محض ان کے ذاتی مفادات کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ یہ اعلیٰ طبقے کے افراد دورخی باتیں کہنے کے ماہر ہوتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں اگر وہ مدارس سے متعلق زبان کھولتے ہیں تو ان کا موقف یہ ہوتا ہے کہ مدارس اور اہل مدارس دنیا سے منقطع اور دقیانوسیت کے شکار ہیں، جب کہ خود اپنے متعلقہ ممالک میں وہ اہل مدارس یا راسخ العقیدہ طبقے کی خوشامد و چاپلوسی میں لگے رہتے ہیں۔ دوسرے درجے کے وسیلۂ معلومات پر انحصار نہ کرتے ہوئے وقت کا تقاضا ہے کہ یہ سمجھنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی کوشش کی جائے کہ مدارس سے تعلق رکھنے والے امریکہ کے مخالف یہ کون لوگ ہیں؟ ان سے متعلق مکمل معلومات بہم پہنچائی جائے اور ثقافتوں کے درمیان پیدا شدہ خلیج کو کم کرنے کے لیے ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔

ایک فیصلہ ساز کی حیثیت سے آپ کو اچھی طرح یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مسلم معاشروں میں مدارس اور علما کی اہمیت اور ان کا کردار کیا ہے؟ علما مذہبی تعلیم یافتہ افراد کا وہ طبقہ ہے، جو مسلم سماج کی خدمت کو حرزِ جان بنائے ہوئے ہے۔ علما کا یہ طبقہ مدارس کے فضلا پر مشتمل ہوتا ہے جن کی تربیت اسی طرح ہوتی ہے جس طرح امریکہ یا بعض دوسرے ممالک کے مذہبی اسکولوں میں عیسائی مذہبی علما کی تربیت کی جاتی ہے۔ آپ غور کر سکتے ہیں کہ اگر ملک ''الف'' ملک ''ب'' کے مذہبی طبقے کو اس وجہ سے اپنی جنگ کا نشانہ بنائے کہ اس کے مذہبی طبقے کے بعض لوگ تخریب کارانہ سیاسی سرگرمیوں میں مشغول ہیں تو اس نوع کی حرکت کے نتیجے میں اس مذہب سے تعلق رکھنے والا مذہبی طبقہ عالمی سطح پر الگ تھلگ ہو کر رہ جائے گا۔ امریکہ نے افغان پاک سرحدی علاقے میں فوجی اور ثقافتی سطح پر جو جنگی مہم چھیڑ رکھی ہے، اس کے نتیجے میں ایسے ہی مظاہر سامنے آرہے ہیں۔

مسلم آبادی کے لحاظ سے جنوبی ایشیا کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں مسلمانوں کی کل آبادی کا تخمینہ 489 ملین ہے۔ یہ آبادی تین ممالک — ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں بکھری ہوئی ہے۔ اندازہ ہے کہ 2030 تک جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی تعداد بڑھ کر 679 ملین ہو جائے گی۔ آبادی میں اضافے کے ساتھ ظاہر ہے مذہبی طبقے میں وسعت آئے گی۔ یہ بات آپ کے ذہن نشین رہنی چاہیے کہ کروڑوں افراد پر مشتمل مسلم آبادی علما سے وابستہ ہے اور روزمرہ کی زندگی میں ان کی پیروی کرتی ہے۔ دنیا میں چوبیس گھنٹوں میں پانچ وقت وہ انھی علما کے پیچھے نماز ادا کرتی ہے۔ وہ ان کے جمعہ اور عید کے خطبات سنتی ہے۔ اخلاقی وشرعی امور ومعاملات میں وہ انھی سے رجوع کرتی ہے۔ مصائب وحوادث کی گھڑی میں وہ ان سے دعاؤں کے لیے التماس کرتی ہے۔ تجہیز وتکفین میں یہ علما ہی ہیں، جنھیں لوگ پیش پیش رکھتے ہیں۔ اسی طرح مسلم عوام کو خانگی زندگی کے معاملات — نکاح وطلاق، آمدنی کے صحیح استعمال اور وراثت سے لے کر عالمی سیاست کے معاملات تک میں علما کی رہنمائی شامل ہوتی ہے۔ انتخابات اور سیاسی اجتماعات میں بھی علما پیچھے نہیں رہتے۔ ٹیلی ویژن، ریڈیو، انٹرنیٹ نیز اپنی تحریروں اور کتابوں کے ذریعے وہ دور دراز اور مختلف النوع علاقوں: باندونگ (انڈونیشیا) بالٹی مور (امریکہ) کیشا گار (چین) اور کیپ ٹاؤن (جنوبی افریقہ) کے عوام کی بہت بڑی تعداد کو اپنا مخاطب بنا لیتے ہیں۔

ملیشیا یا ''مالی'' کے ایک عالم، یا بسا اوقات ایک عالمہ، نے خواہ قاہرہ میں تعلیم حاصل کی ہو، تاہم وہ جنوبی ایشیا کے کسی مدرسے کے فاضل کے کائناتی نظریے سے بخوبی واقفیت رکھتا/رکھتی ہے۔ اس کے برعکس کو بھی اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ مدارس اور علما اپنا عالمی نیٹ ورک رکھتے ہیں اور ایک مشترکہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ یہ مشترکہ زبان فقہ اور دینیات کی زبان ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے مسلمان علما کے بارے میں یہ شکوہ کرتے نظر آتے ہیں کہ اُن کے اندر مطلوبہ تفقہ اور دینی بصیرت کی کمی ہے جس کے نتیجے میں نکاح وطلاق، جنسی معاملات اور خانگی زندگی کے تعلق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے ان کے بہت سے تصورات ونظریات حقیقت کی عکاسی نہیں کرتے اور جو معاصر حساس ذہنیتوں کو زک پہنچاتے ہیں، تاہم یہ بھی ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ علما میں روشن فکر اور تاریک الخیال دونوں طرح کے افراد شامل ہیں۔

بعض علما اپنی عوامی مقبولیت میں کسی ''راک اسٹار'' سے کم نہیں۔ شیخ یوسف القرضاوی کا شمار انھی میں ہوتا ہے جن کا تعلق اصلاً مصر سے ہے، لیکن وہ قطر میں مقیم ہیں۔ یہ ان علما میں سے ایک ہیں جن کے افکار ونظریات، ان کے خطبات ومواعظ کے حوالے سے عالم اسلام کے ہزاروں ریڈیو اسٹیشن اور ٹی وی چینلوں سے نشر کیے جاتے ہیں۔[1] ہاں! یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ان علما میں سے سب کے سب امریکہ یا مغرب کے تئیں دوستانہ ذہنی تعلق نہیں رکھتے۔ اسی وجہ سے ان علما کے ساتھ مکالمے کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اس مکالمے کے فکر واحساس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کانگریس کے ارکان، وہائٹ ہاؤس اور غیر ملکی حکومتوں کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے مشیر کاروں میں سے ان لوگوں کے مشوروں کو خاطر میں نہ لائیں جو اس قسم کے مکالمے کی اہمیت کے منکر ہیں اور جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان لوگوں کو اس کام میں لگائیں جو اس کی حقیقت اور فائدوں سے واقف ہیں۔

یہاں اس حقیقت کا تذکرہ کرنا بجا ہوگا کہ مسلم ممالک کے ارباب حل وعقد کا وطیرہ علما سے متعلق یہ ہے کہ وہ انھیں ''داخلی جلاوطنی'' کا شکار بنا کر رکھتے ہیں۔ انھیں علما کی ضرورت اس وقت محسوس ہوتی ہے اور وہ اس وقت ان کی طرف نظر التفات کرتے ہیں جب انھیں انتخابات میں ووٹوں کی فکر ستاتی ہے یا جب کوئی بڑا عالمی بحران سامنے آتا ہے۔ ایسے میں ان علما کو عوامی حلقے میں لایا جاتا ہے تاکہ ان کے ذریعہ ووٹوں کی کاشت کی جا سکے یا عوامی جذبات کو دبایا جا سکے۔

پاکستان جیسے ملک میں جہاں سیاسی نظام تزلزل کا شکار ہے، علما اس معاشرے کے تشویش ناک پہلوؤں سے واقفیت کا ثبوت دیتے ہیں۔[2] 2008 میں امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف جنگی مہم میں پاکستانی فوج کی شرکت کو انھوں نے ''دھوکے'' اور ''شرمناکی'' سے تعبیر کیا تھا۔ علما کا کہنا ہے کہ پاکستان کا اعلیٰ طبقہ اسراف پسند، بدعنوان اور عدالت کی حیثیت کو کم کرنے میں اپنی کوششوں میں بے حیائی کا ارتکاب کرنے والا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر پاکستان کی محبت میں سرشار لوگ علما کے حلقوں کی طرف سے دئے گئے بیانات کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ علما ایک طرف مغرب کے اسلامی معاشرے پر پڑنے والے اثرات کی مذمت کرتے ہیں، دوسری طرف وہ مذہبی انتہا پسندی کی اشاعت کے راستے میں روک کا کام کرتے ہیں۔

علما کی نگاہ میں تعلیم ثقافت کا میدان کارزار ہے۔ وہ لارڈ میکالے کا ذکر نہایت ناپسندیدگی کے ساتھ کرتے ہیں کہ اس نے کہا تھا کہ ہمیں ایک ایسے طبقے کو وجود میں لانا چاہیے جو اپنے خون کے اعتبار سے ہندوستانی لیکن اپنے اسلوب فکر اور رجحان کے لحاظ سے انگریز ہو۔[3] علما سمجھتے ہیں کہ اگر سیکولر تعلیم پر کوئی بندش نہ ہو تو وہ ایک بڑا خطرہ ہے۔ اس سے مسلمانوں کی مذہبی شناخت محفوظ نہیں رہتی۔ اس سے اس بات کا خدشہ ہے کہ مستقبل کی اسلامی نسل یورپ اور امریکہ کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو جائے۔ حال میں کیے گئے ایک مطالعے کی روشنی میں یوسف قرضاوی جیسا عالم بھی یہ تصور رکھتا ہے کہ گلوبلائزیشن کا مقصد پس پردہ دنیا میں مغربی تہذیب کی اشاعت اور بالادستی کا قیام ہے۔[4] مجھے معلوم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ بعض لوگوں کی نگاہ میں یوسف قرضاوی کی شخصیت اشتباہ کے دائرے میں ہے، لیکن جہاں تک مسلمانوں کا معاملہ ہے تو وہ انھیں ایک راسخ العقیدہ عالم ومفکر تصور کرتے ہیں۔ البتہ وہ اسی کے ساتھ یہ خیال بھی رکھتے ہیں کہ ان کے یہاں کسی حد تک آزاد خیالی یا تجدد کی روش پائی جاتی ہے۔

بعض مسلم جماعتوں، جن میں طالبان سرفہرست ہیں، نے مغربی خصوصاً خواتین کی تعلیم کے تعلق سے انتہا پسندانہ نقطۂ نظر اختیار کیا۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ طالبان کا معاملہ استثنائی ہے، ان کے خیالات کو مسلمانوں کی وسیع تعداد مسترد کرتی ہے۔ جنوبی ایشیا میں لڑکیوں کے مدارس اور ریگولر اسکولوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ مزید برآں، مدارس سے تعلق رکھنے والے اصحابِ علم ودانش کی اکثریت اس نقطۂ نظر کی حامل ہے کہ اس حد تک جس حد تک سیکولر تعلیم ان کے طریق زندگی اور اخلاق واقدار کو متاثر نہیں کرتی؛ مسلمان اس سے فائدے حاصل کر سکتے ہیں۔

مدارس اور علما جس دینیات کو پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ ایک ذرا آپ اس کو نگاہ میں رکھیں تو اس سے حقیقت کو سمجھنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ توحید یا ایک خدا میں یقین رکھنا مسلمانوں کے ایمان کی اساس ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف خاتم الانبیا ہی نہیں بلکہ افضل الانبیا بھی ہیں۔ صدیوں قبل پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے اصحاب نے شرک وکفر کے خلاف جنگیں لڑیں۔ ظلم و بے انصافی کے خلاف جہاد کیا اور انسانیت کی عظمت کو بحال کرنے کی کوشش کی۔ علما کے مطابق، دین کی روح اور اس کا جوہر پیغمبر اسلام کے نمونۂ زندگی کے مطابق، زندگی گزارنا ہے۔ پیغمبر محمد کی زندگی کے ماڈل اور دوسری شخصیات — شری رام، حضرت عیسیٰ اور گوتم بدھ — کی زندگی کے ماڈل میں فرق پایا جاتا ہے۔ اسلام میں پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رول کے صحیح ادراک کے لیے مسلمانوں کی عبادات اور مذہبی اعمال کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ چنانچہ پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے ساتھ حساسیت کے ساتھ تعامل بین ثقافتی مکالمے اور مذہبی رواداری وقیامِ امن کی کوششوں کو کامیابی کے ساتھ ہم کنار کرنے کے لیے ضروری ہے۔

مدارس قدیم فقہی مکاتب کی تقلید کا دم بھرتے ہیں اور اس حوالے سے معاصر دنیا کے سماجی تقاضوں کے تحت اپنے دینیاتی (theological) نقطۂ نظر میں تبدیلی بھی لاتے رہتے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں اس عمل میں ان پر قدامت پرستی کی ذہنیت غالب رہتی ہے اور وہ اس کو تعمیری ومثبت انداز میں انجام نہیں دے پاتے۔ یہی حال اسلامی قانون یا شریعت پر عمل کا ہے۔ اس تعلق سے علما کی مختلف جماعتیں لچک یا شدت پسندی پر مبنی رویہ رکھتی ہیں۔ یعنی اس حوالے سے علما کے یہاں یکساں کے بجائے متنوع رویہ پایا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر تمام علما واہل مدارس اپنے پیروکاروں کی اس بات کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے کہ وہ پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہ کی مسخ کاری کے واقعات پر مشتعل ہوں۔ اکثر بین مسلکی کشمکش کی صورتحال اور تنگ ذہن رکھنے والے چھوٹے درجے کے مولویوں کا یہ شیوہ ہوتا ہے کہ وہ اس سے قطع نظر کہ ایسے معاملات میں شریعت کا حکم کیا ہے، لٹھ لے کر میدان میں کود پڑتے ہیں۔ تقریباً ایک صدی پیشتر علمائے دیوبند کے سرخیل مولانا محمود حسن نے گستاخیِ رسول کے واقعات پر مسلمانوں کے آتش زیر پا ردعمل پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ایسی حرکتیں مسلمان رسول کی محبت میں نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ اس سے ان کی انا کو چوٹ لگتی ہے۔

جنوبی ایشیا کے اکثر مسلمانوں کی مذہبی قیادت مغرب اور مغربی اقدار کو اسلامی تہذیب و اقدار کے لیے خطرہ تصور کرتی ہے۔ مدارس کو وہ مغربیت کے مقابلے میں ڈھال تصور کرتی ہے۔[5] جس طرح اٹھارویں صدی میں مدارس کے نیٹ ورک نے استعماری منصوبوں کو ناکام بنانے میں اپنا کردار ادا کیا تھا، اسی طرح آج مدارس مغرب کی نئی استعماری ترک تازیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے ثقافتی قلعے کی حفاظت پر کمر بستہ ہیں۔ ایک معتدل فکر ونظر رکھنے والے عالم لکھتے ہیں: ''مدارس اسلام کے بقائے حیات کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔''[6] ایک دوسری شخصیت کی نظر میں مدارس ''پاور ہاؤس'' کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے مسلمانوں کی اجتماعی وثقافتی شناخت باقی ہے۔ مسلم معاشرے کی مذہبی واخلاقی اقدار انھی کی رہین منت ہیں۔[7] سرد جنگ کے خاتمے کے بعد مدارس کے علما برملا یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ اب مغربی طاقتوں کا اصل حریف اسلام رہ گیا ہے۔[8]

یہ سمجھنا درست نہیں ہوگا کہ اہلِ مدارس دنیا کے سیاسی حالات سے واقف نہیں ہیں۔ بین الاقوامی خبروں اور تجزیوں پر ان کی نگاہیں رہتی ہیں اور امریکہ جس انداز میں خود کو عالمی سطح پر پیش کرتا رہتا ہے، وہ اس سے طیش میں آتے اور بل کھاتے رہتے ہیں۔ ان کے جذبات واحساسات کو جو چیز ٹھیس پہنچاتی اور برانگیختہ کرتی ہے، وہ مشرقِ وسطیٰ میں امریکہ کا کردار، عراق وافغانستان پر امریکہ کی طرف سے جنگ کو مسلط کرنا اور فلسطینیوں کے ساتھ انصاف نہ کیا جانا ہے۔

عالمی سطح پر سیاسی طاقتوں کے درمیان عدم توازن کی جو کیفیت پیدا ہوگئی ہے، اس نے بہت سی مرضیاتی نفسیات کو پروان چڑھنے کا موقع دیا ہے۔ افغان پاک سرحدی علاقے کے بہت سے مذہبی علوم کے حاملین کا مزاج بدقسمتی سے تخریب کاری کی صفت رکھتا ہے۔

آپ کو اس بات کے لیے ذہنی طور پر آمادہ رہنا چاہیے کہ افغان پاک سرحدی علاقے اور عالم اسلام کے دوسرے حصوں میں مذہب، ثقافت اور سیاست کا ایک بڑا الجھا ہوا اور پیچیدہ منظر نامہ سامنے آنے والا ہے۔ یہ بات بھی آپ کے ذہن میں رہنی چاہیے کہ مذہبی رنگ میں رنگا ہوا تشدد جغرافیائی وسیاسی صورتِ حال کی ابتری سے تعلق رکھتا ہے۔ پاکستان میں عدمِ استحکام کی صورتِ حال میں اصلاً کشمیر کے مسئلے کو دخل ہے۔ ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا افغانستان میں ایک ایسی مستحکم اور شمولیت پسند حکومت وجود میں آپائے گی جو علاقے میں امن وسلامتی کی صورتِ حال کو یقینی بنا سکے؟ علاحدگی پسند تحریکات اور نسل پسندی کا نظریہ رکھنے والے عناصر اپنے ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لیے مذہب کی طاقت کو استعمال کرتے ہیں۔ اس بنا پر یہ موضوع گہری تحقیق ومکالمے کا متقاضی ہے۔

اب میں چند ایسے امور کی نشان دہی کرنا چاہوں گا، جن سے پالیسی سازوں کے لیے احتراز لازمی ہے، تاکہ مسلم راسخ العقیدگی کے ساتھ مکالمہ کامیابی سے ہم کنار ہو سکے۔ مسلمانوں کے ساتھ تمام تر تعلقات پر پانی پھیر دینے کے لیے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ راسخ العقیدہ مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کی جائے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مدارس کے نصاب، اقدار اور طرزِ حیات کے بارے میں کوئی چیز اُن پر مسلط کرنے کی کوشش کی جائے۔ مدارس کی قبیح اور پر ہیبت شبیہ سازی کا مطلب ہے: مسلمانوں کے مذہبی وثقافتی اقدار وادارات کو مسترد کر دینا جسے مسلم حلقوں میں شدت کے ساتھ مسترد کر دیا جاتا ہے۔ لوگوں سے مدارس کی حمایت واعانت سے دست کش ہو جانے کی بات کہنے کا مطلب ہے، مسلمانوں کی مذہبی وثقافتی ترجیحات کو خود سے طے کرنا۔

راسخ العقیدہ مسلم طبقے کے ساتھ مکالمے کی پہلی شرط یہ ہے کہ جنوبی ایشیا اور دوسرے مسلم خطوں میں ڈرون حملوں کے سلسلے کو بند کر دیا جائے۔ مبینہ دہشت گردوں کو ملکی قانون کو خاطر میں لائے بغیر ہدف بنانا نہایت خطرناک ہے اور اس کا نتیجہ معصوم اور بے گناہوں کے قتل و ہلاکت کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ مزید برآں اس طرح کی کاروائیاں امریکہ کی معتبریت کو نقصان پہنچاتی ہیں اور حقوق انسانی کے تئیں اس کے التزام عہد کی اہمیت کو کم کر دیتی ہیں۔

علم وشعور کے ساتھ مکالمہ ہی اصل مسئلے کا حل ہے، بالکل اسی طرح جس طرح اعتماد سازی کا عمل مسئلے کے حل میں بنیادی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔ امریکی ویورپی قیادت کو اس خطے کے مستقبل کے ساتھ تعامل کرنے میں متعدد چیلنجز درپیش ہیں۔ سب سے چیلنج آمیز مسئلہ یہ ہے کہ ایسی جماعتوں کے ساتھ جن کا کائناتی نظریہ مغرب سے مختلف ہے، کس طرح باہمی احترام کے ماحول میں گفتگو کی جائے؟ کیا یورپ وامریکہ کسی ایسی دنیا کا تصور کر سکتے ہیں جہاں مضبوطی کے ساتھ تکثیری اقدار پائے جاتے ہوں؟ بامعنی گفتگو کی اساس اقدار پر باہم متفق نہ ہونا ہے۔ مدارس کے ساتھ مکالمے کے عمل سے اختلاف کو برداشت کرنے کا ہنر آئے گا۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ میں نے یہ بات محسوس کی کہ اہل مدارس صرف یہ چاہتے ہیں کہ انھیں چھیڑا نہ جائے۔ وہ اسلام کے مطابق نیکی وپارسائی کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں اور دانش وری کے روایتی سلسلے کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں جو ان کے مذہبی ایقان کو استحکام عطا کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ انھیں یہ برداشت نہیں کہ کوئی دوسرا ان کے طرزِ حیات کو تبدیل کر دے۔ ایک شخص کو دوسرے کے طرزِ حیات میں تبدیلی کا مسئلہ گیارہ ستمبر کے بعد کی دنیا میں امریکیوں کے لیے نامانوس نہیں رہ گیا ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں بکھرے ہوئے لوگوں کی سوچ یہی ہے کہ دوسرے لوگ ان کے اپنے اسلوبِ حیات کا احترام کریں۔

ان شرائط کی تکمیل کا تقاضا ہے کہ اس تعلق سے امریکی سیاسی قیادت کی ذہنیت میں تبدیلی آئے کہ دوسری اقوام، ثقافتوں اور اقدار کے ساتھ کس طرح تعامل کیا جائے؟ بغیر اس بنیادی تبدیلی کے آگے کی راہ نہایت دشوار گزار ہوگی۔ آج کی گلوبلائزیشن کی دنیا کا ماحول اپنے اندر بہت زیادہ نزاکت رکھتا ہے۔ گرین ہاؤس گیسوں کی وجہ سے ہواؤں میں در آنے والی آلودگی سے لے کر بین الاقوامی تعلقات، سفارت کاری، جنگ اور انسانی تعلقات تک یہ ساری چیزیں علم پر مبنی شعور وحساسیت کی متقاضی ہیں۔ یعنی یہ ادراک کرنا کہ ہماری بقا دوسروں کی بقا وارتقا میں ہے نہ کہ انھیں ہلاک وتباہ کرنے میں۔ اصل نقطۂ آغاز اس اصول پر عمارت کی تعمیر ہے کہ دوسروں کی تہذیب وثقافت بھی اتنی ہی قابل قدر ہے جتنی کہ اپنی۔ اس طرح کے بقائے باہم کو یقینی بنانے کے لیے مغرب کے لیے اصل آزمائش کی بات یہ ہے کہ طبقۂ علما

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ساتھ اس کے تعلقات بہتر اور نارمل ہوں۔

مخلص:
ابراہیم موسیٰ
پروفیسر اسلامک اسٹڈیز
کروک انسٹی ٹیوٹ فار انٹرنیشنل پیس اسٹڈیز،
یونیورسٹی آف نوٹرے ڈیم، انڈیانا، امریکہ

حواشی

(1) یوسف قرضاوی کو ان کو استشہادی حملوں کے جواز کے نظریے کی وجہ سے برطانیہ اور امریکہ میں داخلے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ کچھ دنوں قبل قرضاوی کے صاحبزادے نے سابق مصری صدر محمد مرسی کو دوبارہ اقتدار میں لانے کی اپنے والد کی کوششوں کی مخالفت کی دیکھئے: ''**اسامہ عبدالرحمن القرضاوی إلی أبیه یوسف القرضاوی**''۔

(2) The News, "Ulema Open Their Heart to MPs on Terror."

(3) Macaulay's Minute on Indian Education, http://www/english.ucsb.edu/faculty/rraley/research/english/macaulay.html.

(4) Zaman, Modern Islamic Thought, 156-57.

(5) عثمانی (تقی): ہمارا نظام تعلیم، 77، مظہری (وارث) ''فضلائے مدارس.....'' 206-199، منصوری، محمد عیسیٰ ''مغرب'' 9-105

(6) مظہری (وارث): ''فضلائے مدارس''، 199

(7) مصباحی، یسین اختر: قرآن اور جہاد، 63

(8) منصوری، :''مغرب'' 108

(اردو ترجمہ: ڈاکٹر وارث مظہری)

© rasailojaraid.com